اجتہاد اور فقہی بحث و تحقیق

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ
(سابق صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ، و سابق ناظم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

ناشر
ایفا پبلیکیشنز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اجتہاد اور فقہی بحث و تحقیق

محترم حضرات!

میرے لئے بڑی خوشی و مسرت کی بات ہے کہ اسلامی علوم پر وسیع اور گہری نظر رکھنے والے علماء اور اصحاب تحقیق نے عصر حاضر کے فقہی و اجتہادی مسائل کی طرف اپنی توجہ مبذول کرنی شروع کردی ہے۔ آج کا یہ اجلاس اس کی کھلی دلیل ہے۔

علوم وفنون کے خزانوں پر کسی خاص طبقے کا تسلط کبھی نہیں رہا ہے اور نہ اس کی ضرورت تھی۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، تو آپ اچھی طرح واقف ہیں کہ دین اسلام میں کوئی ایسا مذہبی طبقہ نہیں ہے، جو نسلاً بعد نسلٍ مذہبی امور کا وارث ہو، مذہبی جاگیرداری کے مفہوم نے نصرانیت کی کوکھ سے جنم لیا ہے، لیکن دنیائے اسلام کے لیے یہ لفظ غریب اور غیر مانوس ہے۔ اگر بعض اہل علم کی عبارتوں میں اس طرح کی کوئی تعبیر پائی جاتی ہے، تو اس کی بنیاد مغرب کی اندھی تقلید پر ہے۔ ہمارے اس دور میں مذہبی پروہت، رجال دین کی ایسی تعبیر بہت عام ہے حتی کہ عرب ادباء و اہل قلم کے درمیان بھی، یہ لوگ اس لفظ کو ٹھیک اسی مفہوم میں استعمال کرنے لگے ہیں، جس مفہوم پر لفظ ''کہنہ'' عالم نصرانیت میں استعمال ہوتا ہے، لیکن ایسے محتاط اہل قلم جو دین پر مضبوطی سے قائم ہیں اور جو اسلامی فکر اور اسلامی روح کا صحیح تعارف کرانا چاہتے ہیں، وہ حضرات سختی کے ساتھ ایسی عبارتوں کے استعمال سے

پرہیز کرتے ہیں۔

اسلامی علوم، اسلامی فقہ اور عصر حاضر کے اسلامی مسائل کی طرف علمی مدارس ومراکز کے خصوصی توجہ مبذول کرنے پر اپنے رشک ومسرت کے ساتھ اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اسلام میں قسیسیت اور مذہبی جاگیرداری کی گنجائش بھی نہیں ہے۔........اس کے ساتھ ساتھ ایسے علماء کی ایسی جماعت ہمیشہ موجود رہی ہے، جنہیں اپنے فن میں پوری مہارت وبصیرت اور کامل درجہ کا اختصاص حاصل رہا ہے، لیکن اس دور میں جب کہ علم کے مختلف شعبوں میں کافی ترقی ہوئی ہے اور علوم وفنون کا دائرہ غیر معمولی وسعت اختیار کر گیا ہے اور کسی ایک انسان کے بس کی بات نہیں رہی کہ وہ علم کے جملہ اقسام سے واقف اور ہر فن کا ماہر ہو۔ یورپ میں ترقی اس وقت شروع ہوئی، جب کہ وہاں لوگوں نے علم کے مختلف فنون میں سے کسی خاص فن میں مہارت حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا اور وہاں کے علماء نے بیک وقت جملہ علوم وفنون پر حاوی ہونے کی کوشش نہیں کی۔ میرا خیال ہے اس اصول پر اس وقت بھی مشرق سے زیادہ یورپ میں عمل ہو رہا ہے، وہاں ہر شعبے کا ماہر اپنے پیشے اور میدان اختصاص کے متعلق بلا تردد اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ اسے دوسرے شعبوں اور دوسرے فنون کے ماہرین کے میدان اختصاص میں کوئی دخل نہیں ہے، اب ہمارے لیے بھی ضروری ہو گیا ہے کہ ہم اس بات کی پوری کوشش کریں کہ اپنی علمی وفکری کاوشوں کو کسی خاص موضوع اور علم وتحقیق کی بہت سی شاخوں میں سے کئی مخصوص شاخ تک محدود رکھیں۔

مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں بھی اس علمی قافلے کا ہم سفر ہوں اور اس وقت کو غنیمت خیال کرتے ہوئے بعض تجاویز پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں، آپ ہماری اس

بات سے اتفاق کریں گے کہ ہمارے حلقے میں ثقافت کا معیار پست ہوتا جارہا ہے، میں نے یہ چیز مغرب میں بھی محسوس کی اور مجھ سے وہاں کے بعض علماء نے کہا کہ مشرقی علوم کے مطالعہ وتحقیق میں بھی فساد راہ پایا گیا ہے، ضرورت ہے کہ علماء کی نئی نسل صبر واستقلال اور پوری توجہ اور یکسوئی کے ساتھ بحث وتحقیق میں لگے، اس انحطاط کے متعدد اسباب ہیں، جن میں کچھ سیاسی ہیں اور کچھ اقتصادی ومعاشی ہیں۔

استشراق کی ترقی کا راز:

وہاں علم کی مختلف شاخوں میں سے ہر شاخ کے پیچھے شروع سے اب تک کچھ ایسے اشیاء وعوامل کارفرما رہے ہیں، انہیں عوامل نے استشراق کو اس بام عروج تک پہونچادیا۔ اس میں بعض طبیعاتی علوم کا استثناء کیا جاسکتا ہے۔

مستشرقین کی تحقیقات کو اہم مقام حاصل تھا اور مستشرقین اپنی کتابوں کے ذریعہ بڑی اہمیت اور نمایاں حیثیت حاصل کررہے تھے، کیونکہ اس کے پیچھے جو سب سے بڑا عامل کارفرما تھا، امپریلزم تھا (اس کا مقصد ہے کمپنیوں اور اقتصادی اداروں، اور سیاسی نفوذ کے ذریعہ اپنے تاثرات پھیلانا)، اور ہمیں خوشی ہے کہ وہ عامل اب موثر نہیں رہا، چنانچہ مشرق کا سب سے مالدار ملک مسلمانوں کے زیر حکومت تھا اور مغرب ان مسلمانوں کو ان برکات وثمرات کی وجہ سے جو ان کے پاس تھا غیرت اور حسد کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔

مغربی امپریلزم نے نوآبادیات قائم کرنی چاہی، اس لیے اس کے لیے ضروری ہوگیا کہ وہ ان ممالک کی قومی خصوصیات کا جائزہ لے اور وہاں کی عوام کے علمی ودینی مصادر میں شکوک وشبہات اور بداعتقادی پیدا کرے اور ان ممالک کے تعلیم یافتہ نوجوانوں اور اسکالروں کے دل میں احساس کمتری پیدا کرے، تاکہ یہ چیزیں ان ممالک میں بیرونی

اثر ورسوخ قائم کرنے میں معاون ثابت ہوں، کیونکہ تہذیبی وثقافتی اثرات اور عقلی اور علمی سرافگندگی، سیاسی تفوق اور برتری سے زیادہ موثر ہوا کرتی ہیں اور کم ازکم یہ کہ سیاسی نفوذ کے لیے معاون ثابت ہوتی ہیں اور اس کے لیے راہ ہموار کرتی ہیں۔

یہ مستشرقین سامراجیوں کے ہراول دستہ تھے، چنانچہ انہیں سرکاری حلقوں کا بھرپور تعاون ملا اور ڈھیر سامال ان کے تصرف میں دیدیا گیا، بادشاہوں کے دربار اور حکمرانوں کی قلمرو میں ان کا پرجوش خیرمقدم کیا جاتا اور بھرپور اعزازواکرام ہوتا تھا۔

اس حال کا وجود اب ختم ہوگیا، رہا دوسرا حال یعنی اقتصادی، تو اس نے بھی اپنی تاثیر کھودی اور اقتصادی اساس تو وہ انقلاب کا شکار ہوگئی، یہاں تک کہ مشرقی علوم کے مطالعہ وتحقیق کا جاری رکھنا پہلے کی طرح مادی نفع کا باعث نہیں رہا۔

علمی وتحقیقی یکسوئی:

اس دور کے علماء اور تعلیم یافتہ افراد میں محنت اور جانفشانی کی روح کمزور پڑگئی، جس کی وجہ سے علم کا شوق بھی کم ہوگیا اور اس کے ساتھ جدوجہد کی قدرت کا چشمہ خشک ہوگیا۔ میرا اشارہ کسی خاص مدرسے یا علمی مرکز کی طرف نہیں ہے، بلکہ یہ ایک عام بات ہے جسے تقریباً ہر جگہ محسوس کیا جاسکتا ہے۔ حصول علم وکمال کے لیے وہ مکمل یکسوئی اور جان توڑ کوشش جو ماضی کے علماء کا طرۂ امتیاز تھا، دور حاضر میں اس کا کوئی وجود باقی نہیں رہا، اس کے اسباب کا تعلق کسی خاص چیز سے نہیں ہے، بلکہ سیاست اقتصاد ومعیشت اور ادب واخلاق سب سے اس کا مساویانہ تعلق ہے۔ اس کے اسباب سے بحث کرنا ناممکن ہے اور نہ یہاں اس کی ضرورت ہے۔ بہت واضح سی بات یہ ہے کہ علم کا شوق جو ہر چیز پر فوقیت

رکھتا ہے اور انسان کواس درجہ بے قرار کر دیتا ہے کہ وہ کھانے پینے اور لباس و پوشاک کی بھی پرواہ نہیں کرتا، وہ شوق اگر ختم نہیں ہوا ہے،تو نادر و نایاب ضرور ہوگیا ہے۔

علم برائے علم:

ماضی میں ایک تنہا عالم متعدد اکیڈمیوں کا کام انجام دیتا تھا، اب صورت حال یہ ہوگئی ہے کہ بڑی بڑی اکیڈمیاں اور علمی و تحقیقی ادارے قائم ہیں، لیکن اس کے باوجود نتائج اور کارکردگی تشفی بخش نہیں ہے اور کوئی اہم اور نئی تحقیق کم ہی سامنے آتی ہے۔

اس وقت ہمیں اس کی شدید ضرورت ہے کہ ثقافتی معیار بلند ہو، رسوخ فی العلم اور فقہی بصیرت میں ترقی ہو، علم میں ایک طرف محنت ہے، پھر اس کا ثمرہ ہے، پہلے پیاس ہے پھر آسودگی ہے، بھوک ہے، پھر شکم سیری ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ علم و جستجو کی راہ میں پوری دیانتداری کے ساتھ محنت کرے اور اس کو وہ اپنے عمل کا بدلہ اور مکافات تصور کرے اور اس محنت اور تخصص کو کسی یونیورسٹی میں اونچی پوسٹ کا ذریعہ بنائے۔

اس دور کا ایک المیہ یہ ہے کہ اہل علم اپنی محنت کا ثمرہ نقد وصول کرنا چاہتے ہیں اور ان کی زیادہ توجہ شہرت و ناموری، عہدہ کی ترقی اور زیادہ معاوضہ حاصل کرنے پر مرکوز رہتی ہے اور ان کی طاقت و صلاحیت کا حصہ ان مقاصد کے حصول کی راہ میں صرف ہوتا ہے، گویا مادی منفعت ہی ان کی نگاہ میں اصل معیار ہے، آپ نے بہت سے اصول کے بارے میں سنا ہوگا اور نیا اصول جو ہمارے ثقافتی اداروں میں عام ہے، وہ ہے کیریرزم (Careerism)۔

علم کی پیاس وقتی نہیں ہونی چاہیے:

دوسری چیز یہ ہے کہ ثقافتی سرگرمیوں کی طرف نظر اور توجہ سرسری نہیں ہونی چاہیے

کہ ہم غور وفکر کے لیے ایک موضوع کا انتخاب کریں، پھر فوراً ہی جگالی کر کے اسے باہر ڈال دیں، جیسا کہ جانور جگالی کیا کرتا ہے، پس ایسا نہ ہو کہ ہمیں نہ موضوع کا زیادہ اہتمام والتزام ہو اور نہ اس سے کوئی گہرا ربط و تعلق ہو کہ جب اس موضوع پر بحث ختم ہو جائے، تو ہم ہاتھ جھاڑ کر ایک ہو جائیں، اس موقع پر اقبال کا یہ شعر ہمارے پیش نظر رہے:

مقصود ہنر سوز حیات ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثل شرر کیا؟

اسلامی تحقیق کے سرچشمے ایمان میں پوشیدہ ہیں:

اسلامی علوم اور عصر حاضر کے دینی مسائل میں اجتہاد کی ضرورت کا تذکرہ آپ علمی و دینی مقالات میں ضرور پڑھتے ہوں گے اور ہم میں سے ہر شخص کو اس ضرورت کا احساس اور اس فکر سے اتفاق ہوگا، لیکن سوچنا یہ ہے کہ باب اجتہاد بند کیوں ہوگیا؟ اس کے اسباب کیا ہیں اور اس دعوی میں کس درجہ صحت ہے؟ یہ ایک دوسرا مسئلہ ہے اور عنقریب میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کروں گا کہ علوم اسلامیہ کے اصول دین میں پوشیدہ ہیں اور دین ہی ان اصولوں کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ ہمارا موقف مستشرقین سے جداگانہ ہو اور یہ کہ ہمارا موقف کسی اکیڈمی جیسا نہ ہو کہ ہم کسی التزام اور احساس ذمہ داری کے بغیر مسائل پر بحث کریں، بلکہ ان کے بارے میں ہمارا اعتقاد یہ ہونا چاہیے کہ یہ چیزیں ارکان ایمان کے ساتھ مربوط اور ہماری علمی زندگی میں جاری وساری ہوں، میں نے بچپنے میں مقولہ سنا تھا:

برائے یک من علم دہ من عقل باید

اگر ایسا نہ ہو، تو انسان علم کا حقیقی فائدہ حاصل نہ کر سکے گا اور نہ مناسب صورت

میں اس کا استعمال کر سکے گا۔ میں اس میں تھوڑی سی ترمیم کرتے ہوئے کہوں گا کہ بحث وتحقیق کے ساتھ مناسب مقدار میں تقویٰ کا ہونا ضروری ہے، کیونکہ یہ مسئلہ اسلامی علوم کا ہے، جس کا دین سے گہرا ربط ہے۔ لہذا ان دینی اصول کو بحث وتحقیق کے سامنے اس طرح پیش نہیں کر سکتے، جس طرح کسی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے پیش کیا جاتا ہے، جی ہاں! انصاف کا تقاضہ یہ نہیں ہے کہ ایسا ہو، اس لیے یہ بھی ضروری ہے کہ بحث نقد واعتراض، استہزاء اور تمسخر اور تحقیر وتذلیل سے خالی ہو۔ جن حضرات کو بحث وتحقیق کی ذمہ داریوں کا شعور اور افکار ونظریات کی تبدیلی کا احساس ہے، انہیں چاہیے کہ وہ اپنی آراء واحکام کو قطعی اور یقینی شکل میں پیش نہ کریں اور اپنے کسی نظریے کی توجیہ اس انداز میں نہ کریں کہ گویا وہ اس موضوع پر حرف آخر ہو اور مزید غور وفکر کی اس میں مطلق کوئی گنجائش موجود نہ ہو، بلکہ ان کا موقف اور پیش کرنے کا انداز ایسا ہو، جیسے کوئی کسی نتیجے تک پہونچا اور اس وقت ایسا محسوس ہو رہا ہو کہ وہ صحیح ہے۔ .... ہمارے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم غور وفکر اور بحث ومباحثے میں صبر وتحمل کا اصول اختیار کریں اور علم اور ان حاملین کا اعتراف کرنا سیکھیں، جنہوں نے اپنی زندگی اور اپنی تمام تر طاقتیں اور صلاحیتیں اس راہ میں صرف کر دی ہیں۔

انتشار پیدا کرنے سے اجتناب:

کچھ لوگ اپنی رائے کے اظہار میں بڑی عجلت سے کام لیتے ہیں، پھر فوراً ہی اس سے رجوع بھی کر لیتے ہیں۔ .... اس میں شک نہیں کہ وہ اپنی ذمہ داری پوری کر رہے ہیں، لیکن پھر ان لوگوں کا کیا ہوگا، جو ان کے فتووں کی اتباع کر کے اور غلطی پر عمل کر کے اس دنیا سے چل بسے؟ اور مسئلہ اس وقت زیادہ سنگین ہو جاتا ہے، جب ان آراء کا تعلق دین اور عقیدے سے ہو۔ لہذا ضروری ہے کہ رائے کے اظہار میں صبر کا دامن ہمارے ہاتھ سے نہ

چھوٹے، خاص طور پر جبکہ مسئلہ کا تعلق عالم دین سے ہو،تو ہمیں چاہیے کہ تھوڑی دیر سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور وفکر کریں اور اس فن کے ماہرین کے سامنے اسے پیش کریں، ان کے فیصلوں کا انتظار کریں، ان مرحلوں سے گزرنے کے بعد ہی فتوی کی اشاعت ہو اور اسے منظر عام پر لایا جائے، یہ دور انتشار ہے اور انسان سست وکاہل واقع ہوا ہے،فطری طور پر لاپرواہی کی طرف اس کا میلان ہوتا ہے۔اس زمانہ کی تہذیب،علمی ترقی کی تیز رفتاری اور معیار زندگی میں مسلسل ترقی، یہ وہ چیزیں ہیں،جس نے انسان کو آرام وآسائش کا دلدادہ اور اختلاف و انتشار کا جلد شکار ہوجانے والا بنادیا ہے، جب یہ صورت حال ہے،تو ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم ایسی چیزوں کے اظہار سے باز رہیں، جولوگوں میں فکری اضطراب پیدا کرسکتی ہوں یا اس میں اضافے کا سبب بن سکتی ہوں۔

زمانہ میں تغیرات اور ثبات:

عام طور پر یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ زمانہ میں ثبات اور دوام نہیں ہے، بلکہ تغیر اور انقلاب ہی کا دوسرا نام ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے، زمانہ دو عناصر سے مرکب ہے،تغیر اور استمرار، اگر زمانے میں ان دونوں کا توازن برقرار رہے، اس طور پر کہ استمرار ودوام تغیر اور تبدیلی پر غالب آجائے یا تغیر اور انقلاب ثبات اور دوام پر حاوی ومستولی ہوجائے،تو معاشرہ اور تہذیب وتمدن پر اس کے بہت برے اثرات مرتب ہوں گے، انسانی معاشرے کے لیے ان دو عناصر کا توازن واعتدال کسی بھی کیمیائی مرکب سے زیادہ ضروری ہے۔ زمانہ میں انقلاب کی قدرت وصلاحیت اور اس میں انقلاب کا رونما ہونا ضروری ہے اور یہ کسی ضعف یا نقص کی علامت نہیں ہے، بلکہ وہ تو قانون زندگی ہے اور بقول علامہ اقبال:

جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

لیکن اسی کے ساتھ زمانے میں انقلابات وتغیرات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت بھی بھرپور ہے، تغیر وانقلاب کے آثار ومظاہر واضح طور پر ہمارے سامنے ہیں اور ہم میں سے ہر شخص محسوس کرسکتا ہے کہ کتنے وسیع پیمانے پر تبدیلی رونما ہوتی ہے۔

عام اور مادی امور میں ہمیں اس کشمکش کا پوری طرح احساس نہیں ہوسکتا، جو زمانہ اپنی عمدہ خصوصیات اور اپنی طبیعت اور حقیقی صفت کی حفاظت کے لیے کررہا ہے، اس کے لیے ایک خاص خوردبین کی ضرورت ہے۔

ایک ندی کو لے لیجئے، جو حرکت کا ایک نمونہ پیش کرتی ہے۔............اس کی دو موجیں بالکل ایک جیسی نہیں ہوتیں اور اپنی گزر جانے والی موجوں کے باوجود وہ اپنے نام اور تمام خصوصیات کے ساتھ ہزاروں سال سے اپنی جگہ موجود ہے۔ یہ دجلہ وفرات، دریائے نیل، گنگا اور جمنا، کل پچھلی صدیوں کی طرح آج بھی انہی خصوصیات کی حامل ہیں۔

اسی طرح زمانہ متحرک ہونے کے ساتھ ساکن بھی ہے، زمانہ کی یہ دونوں جوہری صفتیں ہیں، اسی طرح زمانہ اپنی دونوں بنیادی صفتوں میں سے کسی ایک کے بغیر اپنی افادیت باقی نہیں رکھ سکتا، کیونکہ مثبت اور منفی قوتیں عالم میں موجود تمام زندہ ومروجہ چیزوں میں قوت ونمو پیدا کرتی ہیں اور اپنے عمل اور ردعمل کے نتیجہ میں یہ چیزیں اپنی قدر وقیمت کو باقی رکھتی ہیں۔

دین زندگی کا محافظ ہے:

میں اپنے اس عقیدے کے ساتھ کہ یہ دین دائمی وابدی ہے، کبھی اس بات کو قبول نہیں کرسکتا کہ یہ دین کسی حال میں بھی ہر تغیر کو قبول کرسکتا ہے اور آپ لوگ بھی اس سے

اتفاق نہیں کر سکتے ہیں، کیونکہ دین کوئی تھرمامیٹر نہیں ہے، جس کا کام صرف درجہ حرارت کو ناپنا ہوتا ہے اور نہ وہ مرغ بادپیما ہے، جس کے ذمہ صرف ہوا کے رخ کو متعین کرنے کا کام ہو۔

ایسی عبارتوں کے ذریعہ دین کی تعریف نہیں کی جاسکتی اور ہمارے درمیان کوئی ایسا شخص نہیں ہوگا، جو دین کا یہ مطلب سمجھے کہ اس کا کام ایک رجسٹر کی طرح ہے، جو حوادث زمانہ کو بتلاتا ہے، کوئی نام نہاد وضعی دین اس صورت حال کو برداشت نہیں کرسکتا، تو پھر اللہ کا نازل کردہ وہ سچا دین جو قیامت تک کے لیے ہے، وہ کس طرح اس صورت حال کا تحمل کرسکتا ہے۔ دین تغیر وتبدیلی کو ایک حقیقت واقعہ کی طرح تسلیم کرتا ہے اور صحیح سالم انقلاب کی بنا پر امور ومعاملات کے فروغ کے لیے ایک وسیع میدان فراہم کرتا ہے، دین زندگی کے ساتھ شانہ بشانہ چلتا ہے، وہ اس کی جلو میں ایک خادم یا تابع کی حیثیت سے صرف چلنے والا نہیں ہے، بلکہ اس کا یہ بھی فریضہ ہے کہ وہ بتلائے کہ فلاں انقلاب انسانیت کے لیے یا اس کے پیروکاروں کے لیے مفید ہے یا مضر، دین اگر زندگی کے ساتھ ایک طرف چلتا ہے تو دوسری طرف وہ اس کا محافظ، گارڈ اور اتالیق بھی ہے، اس پر اس کی پاسبانی ونگرانی کی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے، ایک مربی اور سرپرست کا یہ کام نہیں کہ اس کی سرپرستی میں جو بچہ ہے، اس کے ہر عمل کو جائز قرار دے، اور اس کے تمام اچھے برے میلانات ورجحانات کی تائید وتصویب کرے اور وہ جس چیز کے پیچھے بھی دوڑ رہا ہے، اس پر تائیدی مہر لگائے، اس کے پاس تو صرف ایک مہر ہے اور ایک سیاہی اور ہاتھ ہے، اس کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ اپنی مہر کسی بھی دستاویز یا چیک پر لگادے، بلکہ اس پر لازم ہے کہ وہ صحیح غلط کے درمیان امتیاز کرے، پہلے وہ دستاویز کی تفتیش کرے، پھر اپنا حکم صادر کرے، اگر اس میں کوئی غلطی وضرر

پایا جائے، تو دین اس کی کوشش کرے کہ نرمی کے ساتھ اسے چھوڑ دے، اگر ایسا ممکن ہو یا اگر ضرورت ہو تو اس سلسلے میں قوت کا استعمال کرے اور اس کے سامنے کوئی نسخہ پیش کیا جائے اور وہ اسے نسل انسانی کے لیے مضر سمجھتا ہے تو محض اس کی تصدیق وتائید اور مہر لگانے ہی سے باز نہیں رہتا، بلکہ اس کے مقابلے کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے، یہیں سے دین واخلاق کے درمیان فرق واضح ہو جاتا ہے۔ دین اپنی ڈیوٹی اور ذمہ داری سمجھتا ہے کہ غلط خیالات اور غلط کام کو روکے اور اس کی راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑا ہو جائے، جبکہ اخلاق اس کے جائز وناجائز اور اس کے ممدوح یا مذموم ہونے کی طرف محض اشارہ کر دینا کافی سمجھتا ہے۔ ہمارے بابصیرت فقہاء اور راسخین علماء کرام کی ذہانت وعبقریت، زمانے کی ترقیات، عرف ومقیاس کے بدل جانے، نئے آلات ووسائل کے وجود میں آجانے، حوادث ومشکلات کے پیدا ہونے، نئے تجربات کے سامنے آنے اور نئی تہذیب سے پیدا ہونے والے مسائل کا حل تلاش کرنے میں پوری طرح ظاہر ہوئی، اسی طرح فتاویٰ اور شرعی احکام میں حالات زمانہ کی رعایت کرنے، روح شریعت اور مقاصد شریعت کی حفاظت کرنے میں دین اسلام کی ابدیت اور اس کے وہ آخری اور پسندیدہ دین ہونے کا اعتقاد رکھنے اور اللہ رب العزت کے فرمان ''**الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا**'' (المائدہ) پر کامل یقین رکھنے پر بھی ان کی ذہانت وصلاحیت کا پورا ظہور رہا۔

اس کا اندازہ کرنے کے لیے ہمیں اس عالمی کتب خانے کا وسیع تاریخی جائزہ لینا ہوگا، جو اسلام کی طویل تاریخ اور عالم اسلام کی وسیع مساحت پر پھیلی ہوئی ہے، اگر یہ کام پوری امانت ودیانت، صبر وتحمل اور غیر جانبداری اور انصاف کے ساتھ انجام دیا جائے، تو

علمی ودینی ذہانت وعبقریت اور قانون سازی کی بے مثال صلاحیت کا اندازہ ہوگا، جو سب کے لیے باعث حیرت وتعجب ہیں اور یہ چیز اس اجتہاد اور فقہی بحث وتحقیق کے حق میں بھی مفید ہوگی، جس کی ضرورت اس دور اور وسیع اسلامی معاشرے کو ہے۔

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس برصغیر کے اندر ماضی قریب میں افتاء اور فقہی تحقیقات کا جو کام ہوا ہے، اس پر ایک سرسری نگاہ ڈالی جائے اور جہاں تک علمی وفقہی تصنیفات وفتاویٰ کے مجموعوں اور حدیث وفقہ کی بحثوں کا تعلق ہے، تو اس مختصر سے مقالہ میں ان کا نام شمار کرنا بھی مشکل ہے، اس کی تفصیلات معلوم کرنے کے لیے ہمارے والد ماجد حضرت علامہ عبدالحی حسنی کی تصنیف ''الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند'' کی طرف رجوع کیا جائے، جسے مجمع اللغۃ العربیہ دمشق نے شائع کیا ہے۔ یہاں پر میں فقہ الحدیث پر علامہ ظفر احمد عثمانی کی تالیف اعلاء السنن کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کروں گا، جو انہوں نے مربی جلیل حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے حکم پر تالیف کی ہے، یہ عظیم تصنیفی کام اکیس ضخیم جلدوں میں مکمل ہوا ہے۔

اسی طرح معاشرتی وازدواجی زندگی سے متعلق بعض پیچیدہ مسائل کا شرعی وفقہی حل تلاش کرنے میں بھی کچھ مفید اور قابل قدر علمی کاوشیں ہوئی ہیں، مثال کے طور پر مربی کبیر عالم جلیل حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ''الحیلۃ الناجزۃ للحلیلۃ العاجزۃ'' اور ''بوادر النوادر'' کا تذکرہ کیا جاسکتا ہے، اسی طرح حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب دیوبندی مفتی اعظم پاکستان کی ''جواہر الفقہ'' تین جلدوں میں، اور ان کی ''احکام القرآن'' اور شیخ عظیم مصلح مولانا عبدالشکور لکھنوی کی ''علم الفقہ'' اور اس کے علاوہ فتاوی کے بہت سے مجموعے ہیں، مثلاً مفتی عزیز الرحمٰن سابق مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند کی ''عزیز الفتاویٰ'' بارہ

جلدوں میں اور حضرت تھانوی کی ''امداد الفتاویٰ'' چھ ضخیم جلدوں میں اور مفتی عبد الرحیم لاجپوری کی ''فتاویٰ رحیمیہ'' چھ جلدوں میں۔

اس بابرکت تاریخی موقع پر میں اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے قیام کا خوشی و مسرت اور احترام و عقیدت کے ساتھ تذکرہ کروں گا، یہ ایک نہایت مبارک اور برمحل اقدام تھا، جو اپنے وقت پر اٹھایا اور یہ مفید تعمیری علمی و فقہی نظریے کے حق میں ایک بڑی فتح شمار کی جائے گی، جس نے جدید فقہی کتب خانہ تیار کرنے اور اس ترقی یافتہ اور روز افزوں ترقی پذیر دور میں علمی کارکردگی کے میدان میں نئے گوشے کھولے اور نمایاں کردار ادا کیا اور یہ اقدام ان لوگوں کے خلاف بھی ایک دلیل ہے، جو فقہی موضوعات پر اختصاص کرنے والوں پر سستی اور کاہلی اور باہم علمی تعاون نہ کرنے اور ایک ساتھ مل کر نہ بیٹھنے کا الزام لگاتے ہیں۔

الحمد للہ اس اکیڈمی کے متعدد کامیاب اور نتیجہ خیز اجتماعات ہو چکے ہیں، اللہ تعالیٰ اس مبارک سلسلے کو تائم و دائم رکھے!

☆☆☆